... ہی نہیں، قانون کی نگاہوں میں بھی۔ ان کی تقدیر میں میری نمائش پسندی کا تاوان دینا لکھا تھا وہ انہوں نے دیا۔ اصلی خطاوار میں ہوں جس کے باعث انہیں یہ عذاب جھیلنے پڑے۔ میں مانتی ہوں کہ میں نے انہیں اپنا بیان بدلنے کے لئے مجبور کیا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ سچ مچ ڈاکوؤں میں شریک ہوئے اور ان کی شہادت واقعات پر مبنی ہے تو میں انہیں تبدیل بیان کے لئے ہرگز آمادہ نہ کرتی۔ جن تاریخوں میں میرے شوہر کا ڈاکوؤں میں شریک ہونا بتلایا جاتا ہے ان تاریخوں میں وہ الہ آباد میں تھے عدالت چاہے تو وہاں کے میونسپل بورڈ کے دفتر سے اس کی تصدیق کر سکتی ہے۔

عدالت نے سرکاری وکیل سے پوچھا کیا الہ آباد سے اس معاملے میں کوئی رپورٹ مانگی گئی تھی؟

سرکاری وکیل نے کہا۔ جی ہاں! مگر ہمیں اس معاملہ سے کوئی بحث نہیں ہے۔

صفائی کے وکیل نے کہا۔ اس سے یہ ثابت ہو ہی جاتا ہے کہ ملزم ڈاکے میں شریک نہ تھا۔ اب صرف یہ امر رہ جاتا ہے کہ وہ مخبر کیوں بنا؟

سرکاری وکیل نے کہا۔ خود غرضی کے سوا اور کیا سبب ہو سکتا ہے؟

صفائی کے وکیل نے کہا۔ میرا دعویٰ ہے کہ اسے دھوکا دیا گیا اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ اسے پولیس سے خائف ہونے کا کوئی سبب نہیں ہے تو اسے دھمکیوں سے مجبور کیا گیا۔

اس کے بعد سرکاری وکیل نے بحث شروع کی۔ جناب والا۔ آج آپ کے ہاں ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا ہے جیسا خوش قسمتی سے بہت کم ہوا کرتا ہے۔ آپ کو جنک پور کی ڈکیتی کا حال معلوم ہے جنک پور کے قریب و جوار میں متواتر کئی ڈاکے پڑے اور پولیس کے عملے مہینوں اپنی جان ہتھیلی پر لئے ڈکیتوں کی تلاش میں سرگرم رہے اور آخر انکی کوشش بارآور ہوئی اور ڈاکوؤں کا سراغ ملا۔ یہ لوگ گھر کے اندر بیٹھے ہوئے پائے گئے۔ پولیس نے یکبارگی

سب کو گرفتار کر لیا۔ لیکن آپ جانتے ہیں ایسے معاملوں میں پولیس کے لئے عدالتی ثبوت کتنا مشکل ہے، عوام جان کے خوف سے شہادت دینے کو تیار نہیں ہوتے، یہاں تک کہ جن گھروں میں ڈاکے پڑے تھے وہ شہادت دینے کے موقعہ آیا تو صاف نکل گئے۔ پولیس اسی الجھن میں پڑی ہوئی تھی کہ ایک نوجوان آتا ہے اور ان ڈاکوؤں کا سرغنہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، وہ ان وارداتوں کا اتنا مسودہ اور مفصل ذکر کرتا ہے کہ پولیس کو اس پر یقین آجاتا ہے، وہ اس موقعہ پر اس آدمی کو پاکر غیبی امداد سمجھتی ہے، یہ آدمی الہ آباد سے کسی معاملہ میں ماخوذ ہو کر بھاگ آیا تھا اور یہاں بھی کون مرتا تھا۔ اس میں اور کوئی صفت ہو یا نہ ہو موقع شناسی کی صفت ضرور ہے، اس موقعہ سے اس نے اپنے مستقبل کی تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا، مخبر بن کر اسے سزا کا تو کوئی خوف تھا ہی نہیں، اس کے برعکس فائدے بے شمار تھے۔ پولیس اس کی خوب آؤ بھگت کرتی ہے۔ اور اسے اپنا مخبر بنا لیتی ہے، بہت ممکن تھا کہ ان وارداتوں کی کوئی شہادت نہ پاکر پولیس ڈکیتی کے ملزموں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتی، لیکن یہ غیبی امداد پاکر اس نے مقدمہ چلانے کا ارادہ کیا۔

لیکن ایسا ہوتا ہے کہ اس اثنا میں اسے تقدیر سازی کے دوسرے موقع ہاتھ آگئے ممکن ہے معنویانہ جماعتوں سے اسے ترغیبیں دی گئی ہوں، ترغیبوں نے اسے مطلب براری کا نیا راستہ دکھا دیا، جہاں دولت کے ساتھ نیک نامی بھی تھی واہ واہ بھی تھی، اور قوم پروری کی شہرت بھی۔ یہ شخص اپنی غرض کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے یہی اس کی زندگی کا مقصد اولیٰ ہے۔ ہم خوش ہیں کہ بالآخر اس کی حق پسندی اس پر غالب آئی۔ چاہے اس کے اسباب کچھ بھی ہوں، بے گناہوں کو سزا دلانا پولیس کے لئے اتنا ہی قابل اعتراض ہے جتنا گناہگار کو چھوڑ دینا، وہ اپنی کارگذاری دکھلانے کے لئے ہی ایسے مقدمہ نہیں چلاتی۔ اس جوان کی ایلہ فریبیوں سے پولیس کی جو بدنامی ہوئی، اور جو سرکار کے روپے خرچ ہوئے اس کی اسے معقول سزا ملنی چاہیئے۔ ایسے دروغ بافوں کو آزاد رہ کر سوسائٹی کے ٹھگنے کا موقعہ

دنیا صریح بے انصافی ہوگی۔ اس کے لئے سب سے موزوں مقام وہ ہے جہاں اسے کچھ دن تہذیب نفس کا موقعہ ملے۔ شاید اس خلوت میں اس کا ضمیر بیدار ہو۔ آپ کو محض یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے پولیس کو دغا دی یا نہیں، اس تنقیح کے صحیح تسلیم کرنے میں اب شک کی گنجائش نہیں۔ اگر پولیس نے اسے دھمکیاں دی تھیں تو وہ پہلے ہی عدالت میں اپنا بیان واپس لے سکتا تھا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ دھمکیوں کا الزام بالکل غلط ہے۔ اس نے جو کچھ کیا اپنی رضا و رغبت سے کیا۔ ایسے آدمی کو اگر سزا نہ دی گئی تو اس کی شعبدہ بازیوں کا سلسلہ قائم رہے گا۔

اس کے بعد صفائی کے وکیل نے جواب دیا۔ یہ مقدمہ انگریزی تاریخ ہی میں نہیں شاید دنیا کی تاریخ انصاف میں اپنی نوعیت کا بے مثال مقدمہ ہے۔ رمانا تھ ایک معمولی طبقہ کا آدمی ہے اس نے تعلیم بھی بہت ہی معمولی درجہ کی پائی ہے وہ اونچے خیالات کا آدمی نہیں ہے الہ آباد کی میونسپلٹی میں وہ کئی سال ملازم رہ چکا ہے وہاں سے اس کا کام چنگی کے روپے وصول کرنا تھا۔ عام دستور کے مطابق وہ تاجروں سے رشوت بھی لیتا ہے اور اپنی آمدنی کی پرواہ نہ کرکے اناپ شناپ خرچ کرتا ہے۔ آخر ایک دن میزان میں غلطی ہو جانے کے باعث اسے شک ہوتا ہے کہ کچھ سرکاری رقم اس کے تصرف میں آگئی ہے وہ اتنا بدحواس ہو جاتا ہے کہ کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتا۔ خفیہ طور پر گھر سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ وہاں دفتر میں اس پر شبہ ہوتا ہے اور اس کے کاغذات کی جانچ ہوتی ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کوئی بے جا تصرف نہیں کیا صرف میزان کی غلطی تھی۔

اس کے بعد اس نے رما کے پولیس کے پنجے میں پھنسنے، فرضی مخبر بننے اور شہادت دینے کا ذکر کرکے سلسلۂ بحث جاری کیا۔

اب رمانا تھ کی زندگی میں ایک نیا تغیر ہو کہ ایک شوقین مزاج اور ملازمت کے دلدادہ نوجوان کو فرض اور حق کے راستے پر لگا دیتا ہے۔ اس کی زوجہ جا لپا اس کی تلاش میں الہ آباد

سے یہاں آتی ہے اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ رما ایک مقدمہ میں پولیس کا مخبر ہو گیا ہے تو وہ اس سے خفیہ طور پر ملنے آتی ہے، رما پولیس کا مہمان ہے اپنے بنگلے میں آرام سے پڑا ہوا ہے پھاٹک پر سنتری پہرہ دے رہا ہے۔ جالپا کو شوہر سے ملنے سے ناکامی ہوتی ہے، تب وہ ایک خط لکھ کر اس کے سامنے پھینک دیتی ہے اور دیبی دین کے ساتھ چلی جاتی ہے، رما یہ خط پڑھتا ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے وہ چھپ کر جالپا کے پاس آتا ہے جالپا اس سے ساری داستان کہہ سناتی ہے اور اسے اپنا بیان واپس لینے پر مجبور کرتی ہے، رما پہلے تو ڈرتا ہے مگر راضی ہو جاتا ہے اور بنگلہ پر جا کر پولیس افسروں پر اپنا ارادہ ظاہر کرتا ہے حکام کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ رما پر غبن کا کوئی الزام نہیں ہے، تو وہ جالپا کو گرفتار کرنے کی دھمکی دے کر اسے اپنے ارادے سے باز رکھتے ہیں، رما ناتھ کی ہمت پست ہو جاتی ہے وہ جانتا ہے پولیس کے اختیارات وسیع ہیں مجبور ہو کر وہ جج کے اجلاس میں اپنے پہلے بیان کی تائید کرتا ہے، آخر ملزموں کو سزا ہو جاتی ہے، رما ناتھ کی اور خاطر داریاں ہونے لگتی ہیں۔

اس کے بعد جو واقعات ہوئے، ان کا مختصر ذکر کرنے کے بعد وکیل صاحب نے فرمایا، میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے جھوٹی شہادت نہیں دی۔ لیکن ان حالات اور ان ترغیبوں پر نگاہ ڈالئے تو اس جرم کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے، اس جھوٹی شہادت کا نتیجہ اگر یہ ہوتا کہ کسی بے قصور کو سزا مل جاتی تو دوسری بات تھی، یہاں تو بیندرہ نوجوانوں کی قیمتی جان بچ گئی، ملزم نے خود اپنی جھوٹی شہادت کا اقبال کیا ہے، کیا اس دلیرانہ حق پسندی کا یہی انعام اسے ملنا چاہیئے۔ جالپا دیوی کی اصول پروری کیا اسی برتاؤ کی مستحق ہے۔ جالپا ہی اس ڈرامہ کی ملکہ ہے، اس کی حق پسندی، اس کی فرض پروری۔ اس کی عصمت اور وفا اس کی بے نفسی غرض کن کن اوصاف کی تعریف کی جائے، اسے معلوم تھا کہ پولیس کی حمایت سے اس کا دنیاوی مستقبل کتنا روشن ہو جائے گا۔ ایک حسینہ کے دل میں جو آرزوئیں ہو سکتی ہیں جالپا کا دل اس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ حمایت حق کے جوش میں ان ساری

تمناؤں کو خیرباد کہتی ہے۔ ایک معمولی عورت ہیں جس نے اونچے درجے کی تعلیم نہیں پائی۔ کیا اتنا ایثار اور اتنی روشن طبعی کسی غیبی امداد کا ثبوت نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایسے مقدمات روز نہیں پیش ہوتے۔ شاید آپ لوگوں کو اپنی زندگی میں پھر ایسے مقدمہ کی سماعت کا موقعہ نہ ملے۔ یہاں آپ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں مگر اس اجلاس کے باہر ایک بہت بڑی عدالت ہے جہاں آپ کے فیصلہ کی جانچ ہوگی۔ آپ کا وہی فیصلہ واجب سمجھا جائے گا جسے یہ باہر کی عدالت بھی واجب تسلیم کرے۔ وہ عدالت کی موشگافیوں میں نہیں پڑتی۔ جن میں الجھ کر ہم اکثر گمراہ ہو جایا کرتے ہیں۔ اکثر پانی کا دودھ اور دودھ کا پانی کر بیٹھتے ہیں۔ اگر آپ جھوٹ سے نائب ہو کر حق کی پیروی کرنے کے لئے کسی کو مجرم ٹھہراتے ہیں تو آپ دنیا کے سامنے عدل کا کوئی اونچا معیار نہیں رکھتے۔

سرکاری وکیل نے اس دلیل کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ فرض اور ایثار اپنی جگہ پر بہت ہی قابل قدر ہیں۔ لیکن جب آدمی نے عمداً جھوٹی شہادت دی۔ اس نے قانون کی نگاہ میں اور اخلاق کی نگاہ میں جرم کیا ہے۔ اور سزا کا مستوجب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے الہ آباد میں بے جا تصرف نہیں کیا اسے وہم تھا۔ لیکن ایسی حالت میں ایک سچے آدمی کا یہ فرض تھا کہ وہ گرفتار ہو جانے پر اپنی صفائی پیش کرتا۔ نہ یہ کہ اپنے کمینے اغراض کے لئے جھوٹ کا جال پھیلاتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا یہ فعل ناواجب ہے تو آپ اسے ضرور سزا دیں۔

فریقین کے وکیلوں کی بحث ختم ہو جانے کے بعد جج نے اسیسروں سے مشورہ کیا اور یہ تجویز سنائی۔ مقدمہ صرف یہ ہے کہ ایک نوجوان نے اپنے کو ایک الزام سے بری کرنے کے لئے پولیس کی پناہ لی۔ اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ جس بنا پر وہ پولیس کی حمایت میں جاتا ہے اس کی کوئی ہستی نہیں تو وہ اپنا بیان واپس لے لیتا ہے۔ رمانا تھ اگر حق پرور ہوتا تو وہ پولیس کی حمایت میں جاتا ہی کیوں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ پولیس نے ایسی جھوٹی شہادت

دینے کی ترغیب دی، میں یہ نہیں مان سکتا کہ شہادت کی تحریک رمانا تھ کی جانب سے ہوئی اسے ترغیب دی گئی، اور سزا کے خوف سے اس نے اسے منظور کر لیا۔ اسے اس بات کا یقین بھی دلا دیا گیا ہوگا کہ جن لوگوں کے خلاف شہادت دینے کے لئے اسے آمادہ کیا جا رہا ہے۔ وہ فی الواقع خطا وار تھے، کیونکہ رمانا تھ میں اگر سزا کا خوف ہے تو احساس حق بھی ہے، وہ اپنے پیشے در گو اہوں میں نہیں ہے۔ جو اپنے مفاد کے لئے جھوٹی شہادتیں دیا کرتے ہیں۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو رما اپنی بیوی کے اصرار سے اپنا بیان تبدیل کرنے پر بھی کبھی راضی نہ ہوتا، اس لئے میں اسے بری کرتا ہوں۔

(۵۲)

چیت کی سہانی فرحت بخش شام، گنگا کا کنارہ، ٹیلوں سے لہلہاتا ہوا ڈھاک کا میدان ایک برگد کا چھتنا درخت۔ اس کے نیچے بندھی ہوئی گائے بھینسیں، کدو اور لوکی بیلوں سے لہراتی ہوئی جھونپڑیاں، نہ کہیں گرد و غبار نہ شور و غل، آرام و سکون کے لئے اس سے بہتر کوئی اور جگہ ہو سکتی ہے۔ نیچے سنہری گنگا، سرخ، سیاہ اور نیلے رنگوں سے چمکتی ہوئی بیٹھے سُروں میں گاتی، کہیں لپکتی، کہیں جھجکتی، کہیں شوخ اور کہیں متین اس طرح بہتی ہوئی چلی جاتی ہے گویا بے فکریوں کا خوشنما بچپن ہنستا چلا جاتا ہو۔

دیبی دین اور رمانا تھ نے یہیں سکونت اختیار کی ہے۔

تین سال گذر گئے ہیں، اسی اثنا میں دیبی دین نے زمین خرید لی ہے باغ لگایا، کھیتی جمائی، مویشی جمع کئے اور مسلسل جد و جہد میں آرام و سکون کا لطف اٹھا رہا ہے اس کے چہرے پر اب وہ زردی اور جھریاں نہیں ہیں بلکہ ایک نئی رونق نظر آ رہی ہے۔

شام ہو گئی مویشی چراگاہ لوٹے، جگو نے انہیں کھونٹے سے باندھا اور تھوڑا تھوڑا بھوسہ لا کر ان کے سامنے ڈال دیا۔ دیبی دین اور گوپی بھی بیل گاڑی پر پوے لادے ہوئے

آپہنچے۔ دیا ناتھ نے برگد کے نیچے زمین صاف کر رکھی ہے وہیں پولے اتارے گئے۔ یہی اس چھوٹی سی بستی کا ہی کھلیان ہے۔ دیا ناتھ نوکری سے برخاست ہو گئے ہیں اور اب دینی دین کے اسسٹنٹ ہیں۔ ان کو اخباروں سے اب بھی وہی عشق ہے۔ روز کئی اخبار آتے ہیں اور شام کو کام سے فرصت پانے کے بعد منشی جی اخباروں کو پڑھ کر سناتے ہیں اور سمجھاتے ہیں۔ آس پاس کے گاؤں کے دس پانچ آدمی روز جمع ہو جاتے ہیں۔ روز ایک چھوٹی سی سبھا ہوتی ہے۔

رما کو تو اس زندگی سے اتنی دلچسپی ہو گئی ہے کہ اب اسے شاید تھانیداری ہی نہیں چنگی کی انسپکٹری بھی مل جائے تو وہ ملازمت کا نام نہ لے۔ روز صبح اٹھ کر گنگا اشنان کرتا ہے اور دن نکلتے نکلتے اپنے شفا خانے میں آ بیٹھتا ہے۔ اس نے طب کی دو چار کتابیں پڑھ لی ہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا علاج کر لیتا ہے۔ بس پانچ مریض روز آجاتے ہیں اور اس کی شہرت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں سے فرصت پا کر اپنے باغ میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کچھ ساگ بھاجی لگی ہوئی ہے کچھ پھل پھول کے درخت ہیں۔ ابھی تو باغ سے محض ترکاری ملتی ہے۔ لیکن امید ہے کہ تین چار سال میں پھلوں کی کافی مقدار پیدا ہونے لگے گی۔

دینی دین نے بیلوں کو گاڑی سے کھول کر کھونٹے سے باندھ دیا اور دیا ناتھ سے بولا۔ ابھی بھیا نہیں آئے۔

دیا ناتھ نے جواب دیا۔ ابھی نہیں۔ مجھے تو اب بہو کے اچھے ہونے کی امید نہیں ہے۔ زمانے کا پھیر ہے کتنے آرام سے رہتی تھیں اور آج یہ حال ہے۔ وکیل صاحب نے اچھی جائداد چھوڑی تھی۔ مگر بھائی بھتیجوں نے سب ہڑپ کر لی۔

دینی دین۔ بھیا کہتے تھے عدالت کرتی تو سب مل جاتا۔ مگر کہتی ہے میں عدالت میں جھوٹ نہ بولوں گی۔

یکایک جاگیشوری ایک بچے کو گود میں لئے جھونپڑے سے نکلی اور بچے کو دیا ناتھ کی گود میں دیتی ہوئی بولی۔ مہتو ذرا چل کر رتن کو دیکھو جانے کیسی ہوئی جاتی ہے۔ زہرہ اور بہو دونوں رو رہی ہیں۔

دیبی دین نے منشی جی سے کہا۔ چلو لالہ دیکھیں۔

جاگیشوری بولی۔ یہ جا کر کیا کریں گے بیمار کو دیکھ کر تو آپ ہی ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔

دیبی دین نے رتن کی کوٹھری میں جا کر دیکھا رتن بانس کی ایک کھاٹ پر پڑی تھی جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا وہ سورج مکھی کا سا کھلا ہوا چہرہ مرجھا کر زرد ہو گیا تھا وہ دل نواز ہستی اور مسرت میں ڈوبا ہوا نغمہ فضا میں غائب ہو گیا تھا۔ صرف اس کی یاد باقی تھی زہرہ اس کے اوپر جھکی ہوئی اسے دردناک اور مجبور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ آج سال بھر سے اس نے رتن کی بیماری میں اپنے تئیں قربان کر دیا تھا۔ رتن نے اس کے ساتھ جو محبت آمیز برتاؤ کیا اس بے اعتباری اور حقارت کے ماحول میں جس خلوص اور دلیری کے ساتھ بہنا پا جوڑا تھا اس کا احسان وہ اور کس طرح مانتی جو ہمدردی اسے جالپا سے بھی نہ ملی وہ رتن نے عطا کی۔ اس دوستی میں اس کے دلِ محروم نے شوہر کا لمس پایا اور اولاد کا بھی۔

دیبی دین نے رتن کے چہرے کی طرف فکرمند نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ کتنی دیر سے نہیں بولیں۔

جالپا نے آنکھیں پونچھ کر کہا۔ ابھی ابھی تو بول رہی تھیں، یکایک آنکھیں اوپر چڑھ گئیں اور بے ہوش ہو گئیں۔

زہرہ نے پوچھا۔ کیا بوجی ابھی وید کو لے کر نہیں لوٹے۔

دیبی دین نے آہستہ سے کہا۔ ان کی دوا اب وید کے پاس نہیں ہے۔

یہ کہہ کر اس نے تھوڑی راکھ لی۔ رتن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ منہ ہی منہ میں بُدبُدایا۔
اور چٹکی راکھ اس کے ماتھے پر لگادی۔ تب پکار اٹھی رتن، آنکھیں کھولو۔

رتن نے آنکھیں کھول دیں۔ ادھر ادھر اُدھر وحشت آمیز انداز سے دیکھ کر بولی۔
میرا موٹر آیا تھا نا؟ کہاں گیا، وہ آدمی؟ اس سے کہہ دو تھوڑی دیر کے بعد لائے۔ زہرہ!
آج میں تمہیں اپنے باغیچہ کی سیر کراؤں گی۔ ہم دونوں جھولے پر بیٹھیں گے۔

زہرہ پھر رونے لگی۔ رہا لیا بھی سیلاب اشک کو روک نہ سکی۔ رتن ایک لمحہ
تک چھت کی طرف تاکتی رہی۔ پھر یکایک گویا اس کا حافظہ بیدار ہو گیا ہو، شرمندہ
ہو کر ایک غمناک تبسم کے ساتھ بولی۔ میں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔

سُرخ آسمان پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا تھا۔ اسی وقت موت نے رتن کی زندگی پر
پردہ ڈال دیا۔

رما ناتھ وید جی کو لے کر پھر رات کو لوٹے تو یہاں موت کا ناٹا چھایا ہوا تھا۔
رتن کی موت کا غم وہ غم نہ تھا جس میں انسان ہائے ہائے کرتا ہے بلکہ وہ غم جس میں آہیں
خاموش ہو جاتی ہیں، جس میں آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں، جو روح پر ہیبت کی طرح مسلط
ہو جاتا ہے۔

رتن کے بعد زہرہ اکیلی رہ گئی۔ دونوں ساتھ سوتی تھیں ساتھ بیٹھتی تھیں ساتھ کام
کرتی تھیں۔ اب زہرہ کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔ کبھی دریا کے کنارے جا کر رتن کو یاد کرتی اور روتی
کبھی اس آم کے پودے کے پاس جا کر گھنٹوں کھڑی رہتی جسے ان دونوں نے لگایا تھا گویا
سہاگ لٹ گیا۔ جالپا کو بچے کی پرورش و پرداخت اور گھر کے کام کاج سے اتنی فرصت نہ
ملتی کہ اس کے ساتھ بہت دیر تک بیٹھتی اور یہ بھی ایک طرح سے اچھا تھا کیونکہ جب دونوں
ساتھ ہوتیں تو رتن کا ذکر آجاتا اور دونوں رونے لگتیں۔

بھادوں کا مہینہ تھا عناصر معرکہ کارزار گرم تھا بحری فوجیں [illegible] جہازوں پر

چڑھ کر آبی تیروں کی بارش کر رہی تھیں۔ زمین اس پر ورش سے عاجز آ کر گوشۂ عافیت تلاش کرتی پھرتی تھی۔ گنگا گاؤں اور قصبوں کو نگل رہی تھی۔ گاؤں کے گاؤں بہتے چلے جاتے تھے۔ مزہرہ ندی کے کنارے بیٹھی سیلاب کی غائبانہ پر اندازیوں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ وہ لاغر اندام گنگا اتنی جسیم اور مہیب ہو سکتی ہے اس کا وہ قیاس بھی نہ کر سکتی تھی۔ اسی گنگا میں وہ ایک ہلکی سی ڈونگی میں بیٹھ کر جل بہار کیا کرتی ہے۔ آج اس میں پہاڑ کا بھی پتہ نہ لگے گا۔ لہریں جنوں کے عالم میں گرجتیں، منہ سے پھین نکالتی بلیوں اچھل رہی تھیں۔ کبھی لپک کر آگے جاتیں، پھر پیچھے لوٹ پڑتیں اور چکر کھا کر آگے دوڑتیں۔ کہیں جھونپڑا ڈگمگاتا تیزی سے بہا جا رہا تھا، گویا کوئی شرابی دوڑا جاتا ہو۔ کہیں کوئی درخت ڈال پتوں سمیت ڈوبتا اترتا کسی دور بحر کے کو ہ قامت جاندار کی طرح تیرتا چلا جاتا تھا۔ گائے بھینسیں، کھاٹ کھٹولے طلسمی تصویروں کی طرح آناً فاناً میں آنکھوں کے سامنے سے نکل جاتے تھے۔ اور ایک بار غائب ہو کر ایک فرلانگ کے بعد پھر نکل پڑتے تھے۔

دفعتاً ایک کشتی نظر آئی۔ اس پر کئی مرد عورت بیٹھے ہوئے تھے۔ بیٹھے کیا چمٹے ہوئے تھے۔ کشتی زیر و زبر ہو رہی تھی۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب اُلٹی۔ اب اُلٹی مگر واہ ری ہمتِ مردانہ سب کے سب اب بھی گنگا ماتا کی جے کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔ عورتیں اب بھی گنگا کے گیت گا رہی تھیں۔ مرگ و حیات کی کش مکش کا کتنا ہیبت ناک نظارہ تھا۔ دونوں طرف کے آدمی سینوں پر ہاتھ رکھے شدتِ سکون کی حالت میں کھڑے تھے۔ جب کشتی کروٹ لیتی تو لوگوں کے دل اُچھل اُچھل کر لبوں تک آ جاتے۔ رسیاں پھینکنے کی کوشش کی جا رہی تھی، مگر وہ ساحل سے تھوڑی دور ہی گر پڑتی تھیں۔ یکایک ایک بار کشتی اُلٹ گئی۔ وہ سب ہستیاں بحرِ فنا میں غرق ہو گئیں۔ ایک لمحے تک کئی مرد و عورت ڈوبتے نظر آئے۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ صرف ایک سفید سی چیز ساحل کی طرف چلی آ رہی تھی۔ ایک ہی ریلے میں وہ ساحل سے کوئی تیس گز قریب آ گئی۔

اب معلوم ہوا کوئی عورت ہے۔ زہرہ، جالپا اور رمانا تھ تینوں ہی آ پہونچے تھے۔ عورت کی گود میں ایک بچہ بھی نظر آ رہا تھا۔ دونوں چشم زدن میں کہاں سے کہاں جا پہنچیں گے۔ انہیں کیسے گنگا کے منہ سے نکال لیا جائے۔ تینوں ہی بے تاب تھے۔ تینوں بیکسانہ اضطراب سے اس عورت کی طرف دیکھتے تھے۔ اور دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے تھے۔ عورتیں معذور تھیں۔ رمانا تھ تیرنا جانتا تھا لیکن لہروں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہیں لہروں کے زور میں پاؤں اکھڑ جائیں۔ تو خلیج بنگال کے سوا کہیں ٹھکانہ نہ لگے۔

زہرہ نے بے صبر ہو کر کہا۔ ابھی دونوں زندہ ہیں۔ جالپا سمجھ!

اور وہ ایک بے ہوشی کے عالم میں پانی میں چل پڑی۔

رمانا تھ نے شرمندہ ہو کر کہا۔ تم کہاں جاتی ہو زہرہ! تیار تو میں بھی تھا لیکن وہاں تک پہونچ بھی سکوں گا۔ اس میں شک ہے دیکھتی نہیں ہو پانی میں کتنا تو ڑ ہے۔

زہرہ گھٹنے تک پانی میں جا پہنچی تھی۔ بولی۔ نہیں تم نہ آنا خدا کے لئے میں ابھی نکالے لاتی ہوں۔

وہ کمر تک پانی میں پہنچ گئی۔ رمانا تھ گھبرا کر بولا۔ کیوں ناحق جان دینے جاتی ہو زہرہ! خدا کے لئے لوٹ آؤ۔ ٹھہرو میں آتا ہوں۔

زہرہ نے ہاتھوں سے منع کرتے ہوئے کہا۔ نہیں نہیں تمہیں میری قسم۔ تم نہ آنا۔ میں ابھی لئے آتی ہوں۔ مجھے کچھ کچھ تیرنا آتا ہے۔

جالپا نے کہا۔ لاش ہو گی اور کیا۔

رما بولا۔ شاید ابھی جان ہو۔

جالپا۔ اچھا زہرہ تیر بھی لیتی ہے مجھی ہمت پڑی۔

رما نے زہرہ کی طرف فکرمند نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ہاں کچھ کچھ جانتی تو ہے۔ مگر

لوٹ آئے تو کہیں۔ مجھے اپنی پست ہمتی پر شرم آ رہی ہے۔

جالیا نے بے چین ہو کر کہا۔ اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔ مُردہ لاش کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈالنا کونسی عقلمندی ہے۔

رما نے اپنے نفس کو ملامت کرتے ہوئے کہا۔ یہاں سے کون جا سکتا ہے زندہ ہو یا مُردہ۔ واقعی بال بچوں والا نامرد ہو جاتا ہے۔ میں کاٹھ کے اُلّو کی طرح کھڑا رہا اور زہرہ چلی گئی۔

زہرہ ہاتھ پیر مارتی لاش کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اتنے میں ایک لہر آئی اور لاش کو پھر ساحل سے دور کھینچ لے گئی۔ زہرہ خود اس کے زد میں آ گئی اور کئی ہاتھ بہاؤ کی طرف چلی گئی۔ وہ پھر سنبھلی۔ پر ایک دوسرے ریلے نے پھر اُسے ڈھکیل دیا۔ وہ کسی طرح نہ سنبھل سکی۔ اس نے چیخ ماری اور پانی میں سما گئی۔

رما بے تاب ہو کر پانی میں کود پڑا۔ اور زور زور سے پکارنے لگا۔ زہرہ زہرہ میں آتا ہوں۔

مگر زہرہ میں اب لہروں سے جنگ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ پھر باہر نکلی۔ مگر ایک فرلانگ پر وہ بھی جا رہی تھی۔ اس کے اعضا میں کوئی بھی حرکت نہ تھی۔

یکایک ایک ایسا ریلا آیا کہ وہ بیچ دھار میں جا پہنچی۔ اب صرف اس کے سر کے بال نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی صرف ایک لمحے تک۔ پھر وہ نشان بھی غائب ہو گیا۔ یہی اس کی آخری دیدار تھی۔

رما ایک سو گز تک ہاتھ پاؤں مارتا لہروں کا سامنا کرتا گیا۔ لیکن اتنی سی دور میں اس کا دم پھول گیا۔ اب آگے کہاں جائے۔ زہرہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہی آخری جھلک آنکھوں کے سامنے تھی۔

کنارے پہ جالیا کھڑی ہائے ہائے کر رہی تھی۔ آخر وہ بھی پانی میں گھسی۔

۲۰

رما اب آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک طاقت آگے کھینچتی تھی، دوسری پیچھے آگے کی طاقت میں مایوسی تھی، قربانی تھی، وفا تھی۔ پیچھے کی طاقت میں فرض تھا بندش تھی اور زندگی کی امیدیں تھیں۔ بندش نے روک لیا، وہ لوٹ پڑا۔

کئی منٹ تک جالپا اور رما گھٹنوں تک پانی میں کھڑے اسی طرف تاکتے رہے رما کی زبان تاسف نے بند کر رکھی تھی، جالپا کے غم نے۔

آخر رما نے کہا۔ پانی میں سے نکل چلو ٹھنڈ لگ جائے گی۔

جالپا پانی سے باہر نکل کر کنارے پر کھڑی ہوگئی، پر منہ سے کچھ نہ بولی، موت کے اس طمانچے نے اس کے حواس کو مفلوج سا کر دیا تھا۔ زندگی کی حبابی کیفیت زندگی میں دوسری بار اس کی نظروں کے سامنے آئی۔ رتن کی موت کا پہلے ہی سے اندیشہ تھا، معلوم تھا کہ وہ تھوڑے دنوں کی مہمان ہے۔ مگر زہرہ کی موت تو بجلی کی چوٹ تھی۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے تینوں آدمی روانی دریا کا تماشہ دیکھنے خوش خوش چلے تھے کون جانتا تھا کہ موت انہیں اپنی بے دردیوں کا تماشہ دکھانے کے لئے کھینچے لئے جا رہی ہے۔

ان چار برسوں میں زہرہ نے اپنی خدمت بے نفسی اور پُر انکسار اخلاق سے سبھی کو گرویدہ کر لیا تھا، اپنے ماضی کی یاد کو دل سے مٹانے کے لئے۔ اپنے پچھلے داغوں کو دھو ڈالنے کے لئے اس کے پاس اس کے سوا اور کیا ذریعہ تھا۔ اس کی ساری خواہشیں اور ساری حسرتیں اسی جوش خدمت میں جذب ہو گئی تھیں، کلکتہ میں وہ خط نفس اور تفریح کی چیز تھی، اس وقت شاید کوئی شریف آدمی اسے اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دیتا۔ یہاں وہ ہمدردی اور محبت کی چیز تھی سبھی اس کے ساتھ گھر کے آدمی کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ نتھی دیا ناتھ اور جاگیشوری کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا تھا کہ وہ دیبی دین کی بیوہ بہو ہے۔ زہرہ نے کلکتہ میں جالپا سے محض اس کے ساتھ

رہنے کی التجا تھی۔ مگر اس کا دل ترازوؤں سے خالی نہ تھا۔ جالپا کے خلوص اور بے لوث نے اسے تہذیبِ نفس کی جانب مائل کر دیا تھا۔ رتن کی پاکیزہ اور بے غرض زندگی اسے روز بروز ایثار کی طرف لئے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں غرض کا مشابہ بھی نہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد رما بھی پانی سے نکلا، اور ماتم میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلا۔ اس کے بعد اکثر وہ اور جالپا ندی کے کنارے آ بیٹھتے اور جہاں زہرہ ڈوبی تھی وہاں گھنٹوں دیکھا کرتے۔ کئی دنوں تک انہیں اُمید ہو رہی تھی کہ شاید زہرہ کہیں بچ گئی ہو۔ اور کسی طرف سے ہنستی ہوئی چلی آئے۔ رفتہ رفتہ اُمید کا جھلملاتا ہوا چراغ بھی یاس کی تاریکی میں فنا ہو گیا۔ ہاں ابھی تک زہرہ کی وہ پاکیزہ صورت ان کی آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی ہے۔ اس کے لگائے پودے، اس کی پالی ہوئی بلی، اس کے ہاتھوں کے سلے ہوئے کپڑے یہ سب اس کی یادگاریں ہیں جو خیال کو اس کے وجود کا یقین دلاتی رہتی ہیں۔

ختم شد